بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اشارات

معاشی بحران' قومی ترجیحات اور بجٹ

خورشید احمد

جون کا مہینہ اہل پاکستان کے لیے اضطراب' بے یقینی اور خوف کی علامت بن گیا ہے۔ اس مہینے میں بالعموم سالانہ بجٹ پیش کیا جاتا ہے جو ہر سال اپنے جلو میں طرح طرح کی سوغات لاتا ہے: نئے قرضے' عوام کی مشکلات میں اضافہ' مہنگائی میں افزونی اور ٹیکسوں کی بارش وغیرہ۔ ہر نیا حکمران ساری خرابیوں کا ذمہ دار پچھلوں کو ٹھہرا کر' بہت سے خوش کن وعدوں کی نوید سنا کر' عملاً فرد اور قوم' ہر کسی کی پیٹھ پر بڑے سلیقے اور چالاکی سے کچھ نئے بوجھ لاد دیتا ہے' اور ایک عام شہری مسلسل ایک جاں گسل آزمائش میں مبتلا رہتا ہے' گویا:

زندگی نام ہے مر مر کے جیے جانے کا

مسلم لیگ (نواز شریف) کو دوبارہ برسر اقتدار آئے اب تقریباً ڈیڑھ سال ہو رہا ہے۔ حکومت اس جون میں اپنا دوسرا بجٹ (اگر ان منی بجٹوں کو نظرانداز کر دیا جائے جو تھوک کے بھاؤ سے دوران سال آتے رہے ہیں) پیش کر رہی ہے۔ بجٹ محض حکومتی آمد و خرچ کے میزانیے کا نام نہیں' یہ تو ایک حکومت کی مجموعی قومی حکمت عملی اور خصوصاً اس کی پوری معاشی پالیسی کا مرقع ہوتا ہے۔ نیز اس کی حیثیت اس آئینے کی سی ہوتی ہے جس میں ماضی کی کارکردگی اور مستقبل کے منصوبوں اور پروگراموں کا عکس دیکھا اور جانچا جا سکتا ہے۔ اس لیے یہ مناسب موقع ہے کہ حکومت کی اب تک کی' کم از کم معاشی میدان میں' کارکردگی کا بے لاگ جائزہ لیا جائے اور ملک کے معاشی حالات اور اس کی قومی ترجیحات کی روشنی میں ان بنیادی ایشوز کو متعین کیا جائے جن کی کسوٹی پر نئے بجٹ کو پرکھا جا سکے۔ اس کی ضرورت اس لیے بھی محسوس ہوتی ہے کہ حکومت اور اس کے تمام اداروں کی دلچسپی سنجیدہ پالیسی سازی اور قومی امور پر کھلی بحث کے مقابلے میں پروپیگنڈے اور سبز باغ دکھانے سے زیادہ رہی ہے۔ ڈیڑھ سال کی مدت گزرنے کے بعد بھی نہ تو منزل کی سمت واضح ہے اور نہ کوئی پالیسی۔ اور نظام کار پر ارباب اختیار کی گرفت بھی موثر نہیں ہے--- تمام

دستوری اور انتظامی اختیارات کو شخص واحد کے ہاتھوں میں مکمل طور پر مرکوز کر لینے کے باوجود سارا ہی کاروبار ریاست اصل مسائل سے ایسی شاہانہ بے اعتنائی کے ساتھ چلایا جا رہا ہے کہ مجبوراً کہنا پڑتا ہے ع

نے ہاتھ باگ پر ہے' نہ پا ہے رکاب میں

ویسے تو پاکستان کی سیاست پر ایک ہی طبقہ ہے جو چھایا ہوا ہے' خواہ پارٹیوں اور جماعتوں کے الحاق کے نام کتنے ہی مختلف کیوں نہ رہے ہوں لیکن اس طبقے کے بھی دو گروہ ہیں جو گذشتہ تیس برسوں سے اقتدار پر قابض رہے ہیں یعنی مسلم لیگ اور پیپلز پارٹی!

موجودہ مسلم لیگ نے جنرل ضیاء الحق مرحوم کے مارشل لا کے دوران نیا جنم لیا تھا۔ پہلے ان کے قائم کردہ غیر جماعتی نظام میں اس گروہ نے زمام کار پر گرفت مضبوط کی اور پھر ۱۹۸۵ سے نئے جمہوری نظام میں مسلم لیگ کے جھنڈے تلے مرکز اور صوبوں میں اقتدار سنبھالا۔ اس لیے نہ مسلم لیگ کی موجودہ حکومت کو اور نہ پیپلز پارٹی کے دور میں حکمرانی کرنے والوں کو نیا تصور کیا جا سکتا ہے اور نہ ان کو ماضی میں روبہ کار لائی جانے والی پالیسیوں اور ان کے نتائج سے بری الذمہ قرار دیا جا سکتا ہے۔ آج جو حالات ہیں وہ سب انھی کا کیا دھرا ہے اور ان میں بڑا تسلسل ہے۔ خصوصیت سے بجٹ کے نظام' بنیادی خطوط' معاشی پالیسیوں اور منصوبوں کا اگر تجزیہ کیا جائے تو اس میں ایک حیرت انگیز تسلسل اور یک رنگی ہے۔ لیکن ہم تھوڑی دیر کے لیے اس حقیقت سے صرف نظر کرتے ہوئے مسلم لیگ کی موجودہ حکومت کی کارکردگی کا جائزہ صرف اس کے اپنے منشور (۱۹۹۷) اور اقتدار میں آنے کے بعد' اعلان کی جانے والی پالیسیوں' دعووں اور اس کے پہلے بجٹ (۹۷-۱۹۹۶) میں خود اس کے اپنے مقرر کردہ اہداف کی میزان پر لیں گے۔

سب سے پہلے پاکستان مسلم لیگ کے منشور (۱۹۹۷) کو لیجیے جس کے بنیادی اہداف "خود انحصاری' اہلیت اور معاشی ترقی" تھے۔ منشور میں عوام سے بہت سے وعدے کیے گئے ہیں لیکن صفحہ ۱۱ اور ۱۲ پر "قلیل مدت کا ایک سالہ پروگرام" پیش کیا گیا ہے جسے حکومت کی ڈیڑھ سالہ کارکردگی کے لیے اولیں میزان ہونا چاہیے۔ خصوصیت سے اس لیے کہ "ایک سال" کا تعین خود منشور نے کر دیا ہے۔

(i) افراط زر کی شرح کو کم کرنے کے لیے موثر مالیاتی پالیسی اختیار کی جائے گی اور ٹیکس وصول کرنے کے نظام کو اوورہال کر کے جدید تقاضوں سے ہم آہنگ کیا جائے گا۔

(ii) مالی خسارہ کم کرنے کے لیے حکومت کے انتظامی اخراجات میں بڑے پیمانے پر کمی کی جائے گی۔ مالی بے قاعدگیوں کو دور کر کے قرضوں کی خاطر خواہ فراہمی کو ممکن بنایا جائے گا اور مختلف صنعتوں کو درپیش مشکلات دور کر کے صنعتی سرگرمیوں کے فوری احیا کو ممکن بنایا جائے گا۔

(iii) زرعی پیداوار بالخصوص عام آدمی کی زندگی پر فوری اثر مرتب کرنے والی فصلوں کی پیداوار میں

اضافے کے لیے ہنگامی پروگرام شروع کیا جائے گا۔

(iv) ملکی مالیاتی اداروں کی ہنگامی بنیادوں پر اصلاح کی جائے گی اور ان اداروں کی سربراہی ایمان دار اور اہل افراد کو سونپی جائے گی۔ گذشتہ حکومت کے تین سالوں میں بنکوں کے واجب الادا قرضوں میں ۴۳ ارب روپے کا اضافہ ہو چکا ہے۔ ۱۹۹۳ میں یہ قرضے ۸۲ ارب روپے کے تھے لیکن ۱۹۹۶ میں بڑھ کر ۱۲۵ ارب روپے ہو گئے ہیں۔ مسلم لیگ کی حکومت یہ تمام واجب الادا قرضے جلد از جلد واپس لے گی اور اسٹیٹ بنک کی خود مختاری کو یقینی بنائے گی۔

(v) پرائیویٹائزیشن پروگرام کو شفاف اور ٹھوس تجارتی بنیادوں پر تیز کیا جائے گا۔ اس عمل کو شفاف تر بنانے کے لیے ہائی کورٹ یا سپریم کورٹ کا ایک جج نج کاری کمیشن کا ممبر ہو گا۔ تمام بڑی نج کاری کا عمل ٹیلی وژن پر دکھایا جائے گا"۔

یہ پانچ چیزیں تو ایک سال کے پروگرام میں سرفہرست ہیں۔ اس کے ساتھ فوری اہمیت کے چند دوسرے دعوے اور اہداف بھی بیان کیے گئے ہیں جن کا خلاصہ یہ ہے:

(i) صنعتی شعبے کی شرح نمو میں ۱۰ فی صد اضافہ (ص ۱۵)۔

(ii) خود انحصاری کا حصول، بیرونی قرضوں پر انحصار کم کیا جائے گا، بجٹ کو متوازن بنایا جائے گا اور خوراک اور معیشت کے حساس شعبوں میں خود کفالت حاصل کی جائے گی (ص ۲۱)۔

(iii) تمام صنعتی اداروں کو ان کے سرمائے کے تناسب سے سماجی بہبود کے کاموں کا پابند کیا جائے گا تا کہ وہ اپنے علاقے میں سکول اور کلینک قائم کر سکیں (ص ۱۷)۔

(iv) "دولت کی منصفانہ تقسیم" بالواسطہ ٹیکسوں میں کمی اور بلاواسطہ ٹیکسوں پر انحصار (ص ۸)۔

(v) توانائی کے حصول اور آبپاشی کے لیے چھوٹی اور بڑی جھیلیں اور ڈیم بنائے جائیں گے (ص ۹)۔

(vi) جو مزارعین سرکاری زمین کاشت کر رہے ہیں وہ اراضی نہایت کم قیمت پر ان کو فروخت کر دی جائے گی (ص ۱۰)۔

(vii) حکومت کے اخراجات کم کیے جائیں گے خصوصاً سرکاری اہل کاروں کے اندرونی اور بیرونی فضائی دوروں کو محدود کیا جائے گا اور وزیراعظم اور صدر مملکت کے بیرونی دوروں میں ہم سفر افراد کی تعداد محدود کی جائے گی اور حتی الوسع تجارتی پروازوں سے سفر کیا جائے گا (ص ۸۲)۔ وزیروں اور سفیروں کی فوج کی حوصلہ شکنی کے لیے وفاقی اور صوبائی حکومتوں کے وزرا کی حد مقرر کی جائے گی (ص ۵)۔

(viii) منتخب نمایندوں کے اثاثوں کا سرعام اعلان کیا جائے گا (ص ۵) "نجی کاروبار میں مصروف منتخب نمایندوں پر تصادم مفاد کے قانون کے ذریعے واضح پابندیاں عائد کی جائیں گی (ص ۶)۔

(ix) اسلامی فلاحی ریاست کا قیام اور اسلامی نظام معیشت کی ترویج۔

وزیراعظم نے اپنے ۲۷ فروری ۱۹۹۷ کے قوم سے خطاب میں فرمایا تھا:

پاکستان ایک اسلامی نظریاتی مملکت ہے۔ اس میں اسلامی بنک کاری نظام رائج کرنا ہمارا آئینی اور اسلامی فریضہ ہے۔ پاکستان سمیت دنیا کے کئی ممالک میں اسلامی بنک کاری نظام کے کامیاب تجربے کیے جا چکے ہیں۔ میں صدق دل سے چاہتا ہوں کہ پاکستان میں رائج موجودہ نظام بنک کاری کی جگہ اسلامی بنک کاری نظام رائج کر دیا جائے۔

اسی خطاب میں انھوں نے یہ عہد بھی کیا تھا:

ہمارے عوام نے اپنے فیصلہ کن مینڈیٹ میں اپنے اس عزم کا اظہار کیا ہے کہ وہ معاشی بحران سے نکلنے کے بھرپور خواہش مند ہیں۔ عوام کے اس فیصلے پر عمل کرنا ہماری پہلی ذمہ داری ہے اور عوام کے اس فیصلے کے نتیجے میں ہی ہم نے معیشت کی بحالی کو اپنی حکومت کا پہلا ہدف بنایا ہے---- بیرونی قرضوں میں جکڑی ہوئی کسی قوم کو تعیش اور فضول خرچی زیب نہیں دیتی۔ ہم حکومتی اخراجات کو اپنے موجودہ حالات کے مطابق بنانے کی خاطر سرکاری خرچ میں بھاری کمی کر رہے ہیں۔ میں بطور وزیراعظم اپنی ذات پر قومی خزانے سے ایک پیسہ خرچ نہیں کروں گا یہاں تک کہ بعض لازمی قومی فرائض کی ادائیگی کے سوا سرکاری گاڑی بھی استعمال میں نہیں لاؤں گا۔ وزیراعظم ہاؤس کے اخراجات چند روز میں بہت کم کر دیے جائیں گے۔ وزیراعظم، گورنر اور وزرائے اعلیٰ کی سیکورٹی کے نام پر جاہ و جلال کے مظاہرے بند کر دیے جائیں گے۔ ان کے راستوں پر پولیس یا دوسری حفاظتی ایجنسیوں کے بے گناہ نوجوانوں کو دس دس گھنٹے کھڑا رہنے کی سزا دینے کا سلسلہ بند کر دیا جائے گا۔ میں نے تمام وفاقی وزارتوں اور صوبائی حکومتوں کو یہ ہدایت دی ہے کہ وہ بھی سات دنوں کے اندر اندر اپنے غیر ضروری اخراجات ختم کرنے کی سکیمیں تیار کریں---- وفاقی اور صوبائی وزرا کی تعداد مختصر کر دی جائے گی---- جن سرکاری افسروں نے ۱۹۹۰ سے ماہ رواں تک اپنی اوقات سے بڑھ کر شادیوں کی پرتعیش تقریبات منعقد کی ہیں ان کے بارے میں تحقیقات کی جائیں گی اور ان کا احتساب ہو گا---- تمام سرکاری ملازموں کو اگلے پندرہ دنوں کے اندر اپنے تمام اثاثوں کا اعلان کرنا ہو گا اور ظاہر کیے گئے کوائف سے جتنے فالتو اثاثے تحقیقات کی روشنی میں برآمد ہوں گے انھیں ضبط کر لیا جائے گا اور غلط ڈیکلریشن دینے والوں کو سزا ملے گی۔

منشور اور وزیراعظم کے ان تاریخی خطاب میں ویسے تو اور بھی بہت سے موتی اور جواہر ہیں لیکن ہم ان چودہ نکات ہی کی روشنی میں ان کی حکومت کے ڈیڑھ سال کا عمومی جائزہ لینے کی جسارت کر رہے ہیں۔

یہی وہ مرکزی نکات ہیں جن کو خود وزیر خزانہ نے اپنے پہلے بجٹ کی تقریر (۱۳ جون ۱۹۹۷) میں مرکزی اہمیت دی ہے اور حکومت کی معاشی پالیسی اور اپنے بجٹ کے اہداف قرار دیا ہے یعنی:

۱- اقتصادی ترقی کی رفتار میں سرعت تاکہ دس سال میں قومی آمدنی دگنی ہو اور فی کس آمدنی میں دو تہائی اضافہ ہو۔

۲- ترقی کے ثمرات صرف چند ہاتھوں تک محدود نہ رہیں بلکہ پاکستان کا ہر علاقہ اور شہری اس سے مستفید ہو۔

۳- مالیاتی استحکام' محصولات میں اضافہ اور اخراجات کو قابو میں رکھ کر بجٹ کے خسارے میں نمایاں کمی کرنا۔

۴- بیرونی قرضوں اور امداد پر انحصار کم کرنا۔ بیرونی سرمایہ کاری میں اضافہ اور زیادہ مالیت والی برآمدات میں اضافہ۔

۵- واجب الادا قرضوں کی وصولیاں اور نادہندوں کے خلاف سخت اقدامات کرنا۔

۶- سماجی شعبے میں نمایاں ترقی خصوصاً تعلیم' صحت' آب رسانی و نکاسی' روزگار میں اضافہ' قیمتوں میں استحکام اور غربت کی سطح کم کرنا۔

۷- امن و آشتی اور جان و مال کا تحفظ' سستا اور جلد انصاف' کرپشن اور بدعنوانی کا سدباب اور احتساب کے عمل کو تیز کرنا۔

۸- انتظامی ڈھانچے کی تشکیل نو' سرکاری محکموں کے حجم میں کمی۔

۹- دفاع کی مضبوطی۔

۱۰- اسلامی اقدار کا فروغ اور اسلامی معاشی نظام کو مزید فعال بنانا (تقریر کا پیراگراف ۱۲' ص ۷-۸)

وزیر خزانہ نے یہ خوش خبری بھی دی تھی کہ "آیندہ چند ہفتوں میں ان شاء اللہ معیشت کی بحالی کا مرحلہ پایہ تکمیل کو پہنچ جائے گا"۔

منشور کا ایک سال کا ہدف' وزیراعظم کا ایک ہفتے اور پندرہ دن میں اصلاحات کے آغاز کا اعلان اور وزیر خزانہ کی "چند ہفتوں" میں پایہ تکمیل تک رسائی کی خواہش اور نوید---- یہ ہے وہ میزان جس پر موجودہ حکومت کی کارکردگی کو جانچنے کی ضرورت ہے اور یہ میزان ہم نے نہیں' خود حکومت نے تسلیم کی ہے۔ ہم قوم اور اس کے سوچنے سمجھنے والے تمام عناصر کو دعوت دیتے ہیں کہ حکومت کی اب تک کی کارکردگی اور آنے والے بجٹ کو اس کسوٹی پر پرکھے اور اس طرح ٹھیک ٹھیک متعین کرے کہ ہم کہاں کھڑے ہیں۔ آیا ملک و قوم منزل مقصود کی طرف بڑھ رہے ہیں یا یہ عالم ہے کہ۔

ہر قدم دوری منزل ہے نمایاں مجھ سے
میری رفتار سے بھاگے ہے بیاباں مجھ سے

ضرورت تو اس امر کی تھی کہ حکومت کی کارکردگی کا مندرجہ بالا تمام ہی پہلوؤں سے جائزہ لیا جاتا لیکن وقت اور صفحات کی قلت اس کی اجازت نہیں دیتے۔ چنانچہ ہم بجٹ سے پہلے اس کے چند پہلوؤں کی طرف اشارہ کرنے پر ہی اکتفا کرتے ہیں تاکہ بجٹ اور عام معاشی اور اجتماعی کارکردگی کا جائزہ لیا جا سکے۔

وزیراعظم صاحب اور ان کے نورتن اگر برا نہ مانیں تو معاشی کارکردگی اور بجٹ کے آمد و خرچ سے پہلے حکمرانی کے انداز اور مزاج پر ایک نظر ڈال لی جائے کہ تبدیلی کا آغاز--- اگر اس کا آغاز ہونا ہے، تو یہیں سے ہونا ہے۔ ان کا ارشاد تھا کہ تمام منتخب نمایندے اور سرکاری ملازم اپنے اثاثوں کا اعلان کریں گے لیکن نہ صرف یہ کہ اعلان آج تک نہیں ہوا بلکہ ملک معراج خالد کی نگران حکومت نے فروری کے انتخابات سے پہلے جس آرڈی نینس کی رو سے امیدواروں سے دولت کے گوشوارے پر کروائے تھے اور ان میں غلط بیانی کو جرم مستوجب سزا قرار دیا تھا، اسے پہلی فرصت میں اپنی موت آپ مرنے دیا گیا اور اس سلسلے میں کوئی قانون سازی آج تک نہیں ہوئی۔ نتیجتاً ان گوشواروں میں غلط بیانی کے سلسلے میں جو پٹیشن چیف الیکشن کمشنر کو دی گئی اس پر انھوں نے کارروائی سے معذوری کا اظہار یہ کہہ کر کیا کہ متعلقہ قانون ختم ہو چکا ہے۔ سرکاری ملازموں اور شادی بیاہ پر خرچ کرنے والوں کا بال بھی بیکا نہیں ہوا اور مفادات کے تصادم (conflict of intrest) کا قانون بھی کتاب قانون کی زینت نہ بن سکا۔ احتساب کا عمل جس انداز میں چل رہا ہے اس کے بارے میں تو یہ کہنا بے جا نہ ہو گا کہ اس سے ظالموں اور مجرموں کو مظلوم بننے اور پھر قوم کو دھوکا دینے کے لائق بنانے کا کارنامہ انجام دیا جا رہا ہے حتیٰ کہ جو محترمہ اعلان کر رہی تھیں کہ اب آیندہ کبھی وزیراعظم نہیں ہوں گی وہ پھر سے اپنی جگہ بنا رہی ہیں۔

مختصر کابینہ، سرکاری خزانے کو امانت سمجھنا اور کفایت شعاری کا جو حشر ہوا ہے وہ بھی دیدنی ہے۔ چھوٹی سی مرکزی کابینہ کا یہ حال ہے کہ اس میں ۲۷ وزیر، ۲۸ وزرائے مملکت اور ۲۴ وزیر کا درجہ رکھنے والے مشیر ہیں یعنی کل ۷۹ افراد۔ اور اس فوج ظفر موج پر مستزاد دو درجن پارلیمانی سیکرٹری اور قومی اسمبلی اور سینیٹ میں ۳۰ سے زیادہ کمیٹیوں کے چیئرمین جن کو دفتر، سیکرٹری، مکان، ڈرائیور سمیت گاڑی اور الاؤنس کی سہولت حاصل ہے۔ صرف وفاقی وزرا اور مشیروں کی اس ٹیم پر ایک اطلاع کے مطابق (ملاحظہ ہو دی نیشن، لندن، ۱۷ اپریل ۹۸) ساڑھے تین کروڑ روپے روزانہ خرچ ہو رہے ہیں اور صرف ان سترہ مہینوں میں اس "فوج ظفر موج" پر ۱۵ ارب روپے خرچ ہو چکے ہیں۔ واضح رہے کہ نگراں وزیراعظم معین قریشی نے ۱۹۹۳

میں جن پانچ سو قرض نادہندگان کی فہرست شائع کی تھی ان کے ذمہ ۲۳ سال کی نادہندگی کے نتیجہ میں ۸۲ ارب روپے کے قرضے تھے۔ اس مختصر وفاقی کابینہ نے صرف ۱۷ مہینوں میں قومی خزانہ پر ۱۵ ارب کا بوجھ ڈالا یعنی اس رقم کا چھٹا حصہ۔

صوبوں کی وزارتوں کی کیفیت اس سے مختلف نہیں۔ بلوچستان، جو سب سے غریب صوبہ ہے اور جس کی اسمبلی میں کل ۴۴ ارکان ہیں، یہاں بھی کابینہ میں ماشا اللہ ۲۳ وزیر ہیں اور مشیر اس کے علاوہ۔ قصر صدارت اور قصر وزارت عظمیٰ کے مجموعی سالانہ مصارف تین ارب روپے سے زیادہ ہیں جو صحت کے پورے فیڈرل بجٹ سے زیادہ اور تعلیم کے بجٹ سے کچھ ہی کم ہیں۔

بیرونی دوروں کا حال بھی پہلے جیسا بلکہ اس سے بھی بڑھا ہوا ہے۔ اگر بے نظیر صاحبہ نے ۳ سال میں چندرہ بیرونی دورے کیے تو جناب نواز شریف نے سترہ مہینے میں سولہ دورے کیے جو ۶۵ دنوں پر محیط تھے۔ ان کا خاص ہدف سرمایہ کاروں کو ملک میں سرمایہ کاری کے لیے دعوت دینے کا تھا۔ اس لیے جتنے بڑے بڑے وفود کے ساتھ یہ خدمت انجام دی ہے اس نے سارے ریکارڈ توڑ دیے ہیں۔ البتہ سرمایہ کاری میں کوئی قابل ذکر اضافہ نہیں ہوا اور جس طرح پہلے اوسطاً پانچ ساڑھے پانچ سو ملین ڈالر سالانہ بیرونی سرمایہ کاری ہو رہی تھی، اس سال بھی ہوئی ہے، یعنی ساڑھے چھ سو ملین ڈالر۔ ایک طرف سرمائے کو دعوت دی جا رہی ہے اور دوسری طرف تھرمل بجلی میں سرمایہ لگانے والوں کو جس بھونڈے انداز سے ڈرایا دھمکایا جا رہا ہے وہ سارے کیے کرائے پر پانی پھیر دینے کے مترادف ہے۔ اس سلسلے کا ماسٹر پیس چین کا دورہ ہے جس کے بارے میں روایت یہ ہے کہ سٹیل مل کی توسیع کے لیے جس ایم او یو پر ۲۱ جنوری ۹۸ کو دستخط ہوئے تھے اور جس کے بارے میں چینی میزبان پوری تیاری کیے بیٹھے تھے کہ اب معاملات طے ہوں گے، پورے دورے میں اس کا کوئی ذکر ہی نہیں ہوا کہ دفتر خارجہ اسے ایجنڈے میں رکھنا بھول گیا تھا، یعنی:

ہم گئے تھے عرض کرنے مدعا
اور عرض مدعا ہی رہ گیا

حکومت کی پہلی معاشی مہم "قرض اتارو ملک سنوارو" کے عنوان سے اور بڑے طمطراق سے شروع ہوئی لیکن چند ہی ماہ میں بلبلے کی طرح بیٹھ گئی۔ صرف ڈھائی سو ملین ڈالر کے وسائل جمع ہوئے ہیں جن میں سے نصف سے زیادہ نئے قرض کی صورت میں ہیں۔ اب تو کوئی اس کا ذکر بھی نہیں کرتا۔ ان مہینوں میں قرض کا بوجھ مزید بڑھ گیا ہے۔ کشکول گدائی پوری تیزی سے گردش میں ہے اور ملکی معیشت اس دلدل میں مزید دھنستی چلی جا رہی ہے۔ بیرونی قرض جو ۹۱-۱۹۹۰ میں ۱۷ء۲ بلین ڈالر تھا، ۹۳-۱۹۹۲ میں بڑھ کر ۲۲ء۰۴۳

بلین ڈالر ہو گیا۔ ۹۷-۱۹۹۶ء میں پی پی پی اور نگران حکومت کی رخصت کے وقت ۲۹ء۱۱ بلین ڈالر تھا اور اب بڑھ کر ۳۲ بلین ڈالر سے زیادہ ہے۔ اس کے علاوہ ۱۰ سے ۱۱ بلین ڈالر وہ ہے جو جلد ہی ملنے والا ہے اور اس پر بھی سود ادا کرنا پڑتا ہے۔ نیز ۵ء۱۰ بلین ڈالر کے بیرونی کرنسی کے حسابات ہیں' یہ بھی دراصل ایک واجب الادا ذمہ داری (liability) ہیں۔ محتاط اندازے کے مطابق موجودہ حکومت کے سترہ مہینوں میں بیرونی قرض کے بوجھ میں ۵ بلین ڈالر کا اضافہ ہوا ہے۔ سب سے خطرناک بات یہ ہے کہ اس اضافے میں نسبتاً رعایتی سود پر لمبے عرصے کے قرضوں کے مقابلے میں مارکیٹ شرح سود پر کم مدتی اور متوسط مدتی قرضے زیادہ ہیں جن کی وجہ سے سود اور سالانہ ادائیگی (debt-servicing) کے اخراجات بڑھ جاتے ہیں۔ ۹۱-۱۹۹۰ء میں اگر کم مدتی اور متوسط مدتی قرضوں کا تناسب کل بیرونی قرضوں میں ۱۰ فی صد تھا تو اب یہ بڑھ کر ۲۱ فی صد ہو گیا ہے۔ گذشتہ سال سود اور سالانہ ادائیگی کی مد میں ادا کی جانے والی رقم ۹ء۴ بلین ڈالر تک بڑھ گئی ہے۔ گذشتہ پانچ سال میں بیرونی اور اندرونی قرضے میں صد فی صد سے زیادہ اضافہ ہو گیا ہے اور آج ہر خاندان ناکردہ گناہوں کی پاداش میں ایک لاکھ ۶ ہزار روپے سے زیادہ کا مقروض ہے۔ بیرونی امداد اور قرضوں کا اب صرف ایک مصرف ہے اور وہ یہ کہ ان کے ذریعے ماضی کے قرضوں کا سود اور سالانہ ادائیگی کر دی جائے۔ ۹۸-۱۹۹۷ء میں حکومتی اور بین الاقوامی اداروں کی طرف سے آنے والی کل امداد اور قرض دو ارب پینتیس کروڑ دس لاکھ ڈالر تھے جبکہ اس سال اس مد میں ادائیگی دو ارب تیس کروڑ نوے لاکھ ڈالر رہی۔ اس کے معنی ہیں کہ سارے شور شرابے کے بعد جو رقم ملک کو فی الحقیقت موصول ہوئی وہ صرف چار کروڑ بیس لاکھ ڈالر تھی جس کے عوض ہم نے اپنی عزت اور خود مختاری تک ورلڈ بنک' آئی ایم ایف اور مغربی اقوام کی ہاتھوں گروی رکھ دی ہے۔ امریکہ کوئی نئی مدد نہیں دے رہا لیکن ہر سال ماضی کی ذمہ داریوں کے عوض چار سو چھبیس ملین ڈالر ہم سے وصول کر رہا ہے۔ اور ایف ۱۶ کے سلسلہ میں جو رقم اسے پیشگی دی ہوئی ہے' اس کا کوئی حساب ہی نہیں!

یہ تو ہے بیرونی قرضوں کی کیفیت۔ اندرونی قرضے جو حکومت لے رہی ہے اس میں بھی حسب سابق اضافہ ہو رہا ہے اور اب سرکاری ہنڈیوں (Short Term Federal Bonds - STFB) پر شرح سود' مارکیٹ کے ذریعے طے ہو رہی ہے یعنی بذریعہ نیلامی (auction method)' اس لیے شرح ماضی کے ۶ فی صد سالانہ سے بڑھ کر اب ۱۶ فی صد تک پہنچ گئی ہے۔ اور اس مد میں دسمبر ۱۹۹۷ء تک حکومت ۸۴ ارب لیے ہوئے تھی! یہی وجہ ہے کہ بیرونی اور اندرونی دونوں قرضوں پر سود اور اصل کی ادائیگی میں ہر سال ہوش ربا اضافہ ہو رہا ہے۔ ۹۱-۱۹۹۰ء میں اس مد میں کل ادائیگی ۵ء۳۶ ارب روپے تھی جو ۹۳-۱۹۹۲ء میں ۹ء۷۰ ارب روپے تک بڑھ گئی۔ پھر ۹۶-۱۹۹۵ء میں یہ رقم ۸ء۲۰۱ ارب روپے تھی۔ ۹۷-۱۹۹۶ء میں ۶ء۲۵۳ ارب ہو گئی اور

اگلے سال یہ ۳۰۰ ارب سے متجاوز ہو گی۔ اگر یہی صورت حال رہتی ہے تو زیادہ سے زیادہ تین سال میں ملک کے ریونیو کی تمام آمدنی صرف اس قرض وبال کی سالانہ ادائیگی کی نذر ہو جائے گی اور باقی تمام مدات کے لیے صرف مزید قرض کا راستہ باقی رہ جائے گا۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

کیا اسی کا نام معاشی ترقی ہے؟

بنکوں کے نادہندہ قرض داروں کا مسئلہ بھی ملک کی بیمار معیشت میں بڑی اہمیت حاصل کر چکا ہے۔ حکومت کا دعویٰ تھا کہ ان عناصر سے قوم کی پائی پائی وصول کر کے چھوڑے گی لیکن عملاً کیا حاصل ہوا ہے۔ نگران وزیراعظم معین قریشی کے زمانے میں قرضوں کی یہ ڈوبی ہوئی رقم ۸۲ ارب روپے تھی جس میں سے ۲۰ ارب کے بارے میں بتایا گیا کہ وصول کر لی گئی اور ۶۲ ارب قابل وصول رہا۔ بے نظیر کی حکومت کے رخصت ہونے اور نگران وزیراعظم معراج خالد کے زمانے تک یہ ۶۲ ارب پھر بڑھ کر ۱۲۴ ارب ہو گیا یعنی تین سال میں دوگنا ہو گیا۔ خیال تھا کہ موجودہ حکومت کے دور میں اگر یہ بوجھ کم نہیں ہو گا تو کم از کم اس میں اضافہ تو نہیں ہو گا۔ لیکن عملاً اس میں اضافہ ہو گیا ہے اور تیرہ مہینوں میں بڑھ کر یہ رقم اب ۱۵۰ ارب روپے ہے یعنی دو ارب روپے ماہانہ کا اضافہ۔ عملاً ساری رعایتیں دینے کے باوجود ان آٹھ ہزار افراد سے نہ صرف یہ کہ رقم واپس نہیں لی جا سکی بلکہ ایک خاص تعداد کو قرض کے نئے نظام الاوقات (rescheduling) کے نام پر نئے قرضے بھی دے دیے گئے ہیں۔ اسٹیٹ بنک کو رعایتی پیکج کے سلسلے میں تین بار آخری تاریخ کو آگے بڑھانا پڑا اور اسٹیٹ بنک کی نام نہاد آزادی اور خود مختاری کے باوجود گورنر اسٹیٹ بنک کو وزیراعظم کی جھڑکیاں کھانا پڑیں، نوبت استعفیٰ تک پہنچی اور بالآخر بنک کو اپنے قواعد و ضوابط کو تبدیل کرنا پڑا تاکہ نادہندہ بااثر افراد نئے قرض لے سکیں۔ قومی پریس نے اس پر ہزار دہائی دی (ملاحظہ ہو ڈان ' اداریہ نوٹ ' ۱۳ اپریل ' ۱۹۹۸۔ نوائے وقت اور دی نیشن میں ایم آفتاب کا کالم درمدح قرض نادہندگان ' ۱۵ مارچ ۱۹۹۸)

ٹیکس کے نظام میں کوئی نمایاں تبدیلی نہیں لائی جا سکی ہے۔ سی بی آر کی تنظیم نو کا بڑا شور ہے مگر اس کا جو حشر لاہور کی لبرٹی مارکیٹ کے تاجروں نے کیا ہے وہ نشان عبرت ہے۔ ٹیکسوں سے آمدنی کے ہدف کو دوبارہ کم کیا گیا اور پھر بھی کم ترین مد کا بھی صرف ۶۵ فی صد پہلے ۹ مہینے میں وصول ہو سکا ہے اور بجٹ کے خسارے کے بارے میں گمان غالب ہے کہ ۲۹ ارب روپے سے بڑھ جائے گا۔ سرکاری شعبے کی کارکردگی بھی نہایت مایوس کن رہی ہے۔ واپڈا کا خسارہ ۴۰ ارب روپے ' کراچی الیکٹرک سپلائی کارپوریشن کا ۷ء۹۰ ارب

روپے، پی آئی اے کا ۹ ارب روپے اور پاکستان اسٹیل کا ۳ء۴ ارب روپے متوقع ہے۔ بجلی کی چوری واپڈا میں ۴۰ فی صد کے لگ بھگ اور کراچی الیکٹرک میں ۴۳ء۲۴ فی صد ہے۔ بیس فی صد بل ادا نہیں ہو رہے۔ سب سے بڑے نادہندہ مرکزی اور صوبائی حکومتیں اور ان کے زیر انتظام چلنے والی کارپوریشن ہیں۔ واپڈا کا کل قرض ۱۴۰ ارب ہو چکا ہے۔ بجلی کے نرخ نہ بڑھانے کے سارے وعدوں کے باوجود یہ نرخ اور سرچارج دونوں بڑھائے گئے ہیں اور اضافہ بھی ۱۲ فی صد سے ۳۰ فی صد تک ہے۔ جبکہ سرچارج اصل بجلی کی قیمت سے تین گناہ زیادہ ہو گیا ہے۔ اس عذاب سے نجات کی کوئی صورت نظر نہیں آ رہی۔

حکومت کی شاہ خرچیوں اور متمول طبقے کے نمایشی طرز زندگی میں کوئی تبدیلی نہیں آئی۔ بے روزگاری بڑھ رہی ہے اور ناقص سرکاری اعداد و شمار کے مطابق بے روزگاروں کی فوج میں ہر سال کئی لاکھ افراد کا اضافہ ہو رہا ہے۔ سرکاری عملے کی تخفیف (down-sizing) کے نام دو سے تین لاکھ افراد کو بے روزگار کر دیا گیا ہے جبکہ معیشت میں روزگار کے نئے مواقع پیدا ہونے کا عمل بالکل رکا ہوا ہے۔ بڑی صنعت کی پیداوار کساد بازاری کا شکار ہے۔ زراعت میں پیداوار کے اضافے نے قومی پیداوار کو کچھ سنبھالا دیا ہے مگر اس میں پالیسی کا دخل کم اور موسم کا دخل زیادہ ہے۔ بڑی صنعت جو ماضی میں ۸، ۱۰ فی صد سالانہ بڑھ رہی تھی، اب اس کے بہ مشکل اوسطاً ۴ فی صد بڑھنے کا امکان ہے۔ سال گزشتہ اضافے کی یہ شرح ۱۴ فی صد تھی۔ قومی پیداوار کے بارے میں ۶ فی صد کے اضافے کا ہدف تو "یقین سے کہا جا سکتا ہے کہ" پورا نہیں ہو سکتا۔ اگر یہ اضافہ ۵ء۲ اور ۵ء۵ کے درمیان رہتا ہے تو یہ بھی بسا غنیمت ہو گا۔

بے روزگاری میں اضافے کے ساتھ غربت کی سطح اور حجم میں اضافے کا بھی خطرہ ہے۔ نیز دولت کی تقسیم کا رجحان بھی مسلسل دولت مندوں کے حق میں اور غریب طبقات کے خلاف ہے۔ ملک میں معاشی ناہمواریاں برابر بڑھ رہی ہیں۔ ٹیکسوں کا بوجھ عام شہریوں پر زیادہ اور متمول طبقات پر کم ہے۔ اور یہ عدم توازن برابر بڑھ رہا ہے۔ خود آئی ایم ایف کی ایک رپورٹ کے الفاظ میں:

> کم آمدنی والے گروپ (۷۰۰ روپے ماہانہ سے کم) کے لیے فی صد آمدنی میں ٹیکس کا ۶ء۸ فی صد بوجھ، زیادہ آمدنی والے گروپ (۴۵۰۰ روپے ماہانہ) کے ۴ء۳ فی صد کے مقابلے پر زیادہ تھا۔ (دی نیوز، ۱۹ اپریل ۱۹۹۸)۔

گورنر اسٹیٹ بنک اپنے ایک مضمون میں اس صورت حال پر یوں تشویش کا اظہار کرتے ہیں:

> پاکستان میں غربت کی صورت حال حوصلہ افزا نہیں ہے۔ آبادی کا ایک چوتھائی یعنی ۳ کروڑ افراد غربت کی سطح (poverty line) سے نیچے زندگی گزارتے ہیں۔ اس کے ساتھ ہی آمدنی کی تقسیم کی کیفیت بھی وقت گزرنے کے ساتھ خراب تر ہو گئی ہے۔ ان بیس برسوں میں قومی آمدنی میں کم آمدنی

والی ۲۰ فی صد آبادی کا حصہ ۸ء۴ فی صد سے کم ہو کر ۶ء۵ فی صد ہو گیا ہے۔ دوسری طرف اسی عرصے میں زیادہ آمدنی والی ۲۰ فی صد آبادی کا حصہ ۵ء۴۱ فی صد سے بڑھ کر ۳ء۵۴ فی صد ہو گیا ہے۔ (ڈاکٹر محمد یعقوب: Factors Affecting Poverty in Pakistan, an IPS study 1998 ص ۸۷)

عمر نعمان کی کتاب Economic and Social Progress in Asia: Why Paksitan Did not Become a Tiger حال ہی میں ۱۹۹۷ میں آکسفورڈ یونی ورسٹی سے شائع ہوئی ہے، اس میں یہی نتیجہ اخذ کیا گیا ہے اور غربت میں اضافے اور دولت کی تقسیم میں ناہمواری کو معیشت کی کمزوری کے بنیادی اسباب قرار دیا گیا ہے۔ نواز حکومت کے ڈیڑھ سال میں صورت حال مزید خراب ہوئی ہے اور اس دلدل سے نکلنے کی کوئی قابل ذکر کوشش سامنے نہیں آئی۔

حکومت کے کارپرداز دو چیزوں کو اپنی کامیابی قرار دے رہے ہیں۔ ایک بیرونی تجارت کے خسارے میں کمی اور دوسرے افراط زر پر قابو پا کر اسے ۱۲ فی صد سالانہ سے کم کر کے ۹ فی صد تک لے آنا۔

جہاں تک تجارتی خسارے میں کمی کا تعلق ہے اس کی اصل وجہ ملک کی درآمدات میں ۱۱ فی صد کی کمی اور برآمدات میں ۴ء۳ فی صد کا اضافہ ہے (اضافہ کا ہدف ۱۵ فی صد تھا جس کا صرف ایک تہائی حاصل ہو سکا ہے)۔ ہماری نگاہ میں یہ ایک وقتی چیز ہے جو معیشت میں کسی بنیادی بحالی (revival) کا پتا نہیں دیتی۔ معیشت حسب سابق برابر کساد بازاری (recession) اور انجماد (stagnation) کا شکار ہے۔ درآمدات میں کمی کی بڑی وجہ عالمی منڈیوں میں تیل کی قیمت کی کمی ہے (۱۸ ڈالر فی بیرل سے کم ہو کر ۱۰، ۱۱ ڈالر فی بیرل) جو ایک عارضی چیز ہے اور اس پر انحصار نہیں کیا جا سکتا۔ دوسری بنیادی وجہ مشینری کی درآمدات میں کمی ہے (تقریباً ۲۵ فی صد) جو مستقبل کی پیداواری صلاحیت اور نتیجتاً مستقبل کی قدر میں اضافے کے ساتھ (Value-added) برآمدات کے لیے نیک فال نہیں۔ پھر حکومت نے ایک ظلم یہ کیا ہے کہ عوام سے یہ وعدہ کرنے کے باوجود کہ تیل کی قیمتوں میں کمی کا فائدہ عام صارفین کو پہنچایا جائے گا (یہ وعدہ عالمی منڈی میں تیل کی قیمت بڑھنے پر اندرون ملک تیل کی قیمت فروخت کے اضافہ کے وقت کیا گیا تھا) اس بارے میں کوئی اقدام نہیں کیا گیا اور اس طرح سرچارج کی تقریباً ۱۸ سے ۲۰ ارب روپے کی رقم بجٹ میزانیے کے خسارے کو کم کرنے کے لیے استعمال کی جو دراصل عوام پر ایک بالواسطہ ٹیکس بن گئی۔

افراط زر میں کمی کا دعویٰ سب سے زیادہ مضحکہ خیز ہے اور اس سے سرکاری اعداد و شمار کی مزید بے وقعتی ہوتی ہے۔ ہر شخص کا تجربہ ہے کہ مہنگائی میں اضافہ ہوا ہے اور یہ بوجھ ناقابل برداشت ہوتا جا رہا ہے لیکن شماریات کا ادارہ قیمتوں کے اشاریے میں کمی کی ہوائی اڑا رہا ہے۔

یہ ایک ناقابل تردید حقیقت ہے کہ گندم کی قیمت میں اس سال ۵۵ روپے فی بوری (۴۰ کلو) اضافہ ہوا ہے۔ چینی کی قیمت میں ۵۰ فی صد اضافہ اور سیمنٹ کی بوری میں ۳۷ روپے فی بوری اضافہ ہوا ہے۔ بجلی کے نرخ میں ۱۰ فی صد اور گیس میں ۱۲ فی صد اضافہ ہے۔ ٹیلی فون کے مصارف میں ۲۵ فی صد اور اس کے لگوانے کی فیس میں ۱۵۰ فی صد اضافہ ہوا ہے۔ سیلز ٹیکس اور ایکسائز ڈیوٹی میں اضافہ ہوا ہے۔ ٹرانسپورٹ اخراجات بڑھے ہیں۔ زرمبادلہ کی تخفیف (devaluation) ۸۶۷ فی صد ہوئی ہے جس سے تمام درآمد شدہ چیزوں کی بشمول صنعتی خام مال، قیمتیں بڑھ گئی ہیں۔ زر گرداں (money in circulation) میں حسب سابق ۶۷ء۱۴ فی صد اضافہ ہوا ہے۔ شرح سود میں کوئی کمی نہیں ہوئی اور وہ اسی طرح ۱۷ تا ۲۰ فی صد ہیں۔ اگر یہ تمام عوامل اپنی جگہ ہیں تو پھر افراط زر میں کمی کا معجزہ کہاں سے رونما ہو گیا۔ عام صارف اور ہر خاتون خانہ سے لے کر آزاد معاشی تجزیہ نگاروں تک سب کا اندازہ ہے کہ شرح افراط زر ۱۲ اور ۱۵ فی صد کے درمیان ہے، کچھ تجزیہ نگار ۲۰ فی صد کی بات بھی کرتے ہیں لیکن سرکاری دعوے ۹ فی صد کے ہیں۔ اس پر فرنٹیر پوسٹ نے بڑا مناسب لوارتی تبصرہ کیا ہے جس سے ہمیں پورا پورا اتفاق ہے:

> وہ ہمیں یہ یقین دلانا چاہتے ہیں کہ ملک میں افراط زر کی شرح ۱۳ فی صد سے گر کر ۸.۲ فی صد تک آگئی ہے۔ یقیناً یہ اپنی ساکھ کو کچھ زیادہ ہی آزمایش میں ڈالنے کے مصداق ہے۔ ہم میں سے اکثر جانتے ہیں کہ ۱۳ فی صد بھی بازار کی صحیح صورت حال کی عکاسی نہیں کرتا۔ پاکستان میں افراط زر کی شرح ۲۰ فی صد سے اوپر ہی تبدیل ہوتی رہی ہے۔ کوئی ۸۱ء فی صد کی کہانی پر یقین کرنے کو تیار نہیں ہو گا جو ہمارے وزیر خزانہ بیان کر رہے ہیں۔ اگر وہ کسی عام گھریلو خاتون کو یہ بتانے کی کوشش کریں گے تو اس کا جواب خندہ استہزا کے سوا کچھ نہ ہو گا۔

حکومت کے ان دعووں سے ایک بار پھر اس امر کی ضرورت ابھر کر سامنے آتی ہے کہ اعداد و شمار پر حکومت کی اجارہ داری ختم کیے بغیر صحیح معلومات سے قوم محروم رہے گی اور صحیح معلومات کے بغیر نہ صحیح پالیسی سازی اور منصوبہ بندی ہو سکتی ہے اور نہ حکومت کے دعووں کو قبولیت حاصل ہو سکتی ہے۔ افسوس ہے کہ مرکزی شماریات کا شعبہ حکومت کی گرفت میں ہے، نیشنل ڈیٹابیس آرگنائزیشن ابھی تک رحم مادر میں ہے۔ اسٹیٹ بنک اپنی نام نہاد خود مختاری کے باوجود آزادانہ طور پر اعداد و شمار مہیا کرنے کی پوزیشن میں نہیں اور حسب سابق وزارت خزانہ اور وزیراعظم کی دفتر کے اشارہ چشم و ابرو کا پابند ہے۔ یہ سب اچھی حکمرانی اور صحت مند پالیسی سازی کے لیے سم قاتل ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ ملک شدید معاشی بحران کا شکار ہے۔ حکومت اس ڈیڑھ سال میں معاشی میدان میں کوئی بنیادی تو کیا معمولی سی قابل ذکر مثبت تبدیلی بھی نہیں لا سکی ہے اور تاجر دوست حکمرانوں نے معاشی

ماہرین کو ہی نہیں خود تاجر برادری کو بھی بری طرح مایوس کیا ہے۔ عام آدمی تو نوحہ کناں ہے ہی۔

ڈیڑھ سال کے معاشی حالات اور حکومت کے متعدد اصلاحی منصوبوں (packages) کے بے لاگ تجزیے کے بعد ہم اس ناخوش گوار نتیجے پر پہنچے ہیں کہ موجودہ حکومت ملک کے معاشی بحران اور اس کی گہرائی اور گیرائی کا کماحقہ ادراک ہی نہیں کر سکی ہے۔ اوسط درجے کے کاروباری ذہن اور بیورو کریٹک اسلوب سے روایتی انداز میں ہر طرف ہاتھ پاؤں مارنے کی کوشش ضرور کی گئی ہے لیکن اسے نہ حالات کا حقیقت پسندانہ تجزیہ قرار دیا جا سکتا ہے اور نہ اس سے کسی مربوط پالیسی کے خدوخال سمجھے جا سکتے ہیں۔ صاف محسوس ہوتا ہے کہ حکومت کے پاس کوئی ایسی ہمہ گیر معاشی حکمت عملی موجود نہیں ہے جس سے یہ امید بندھے کہ اس حکومت کے ہاتھوں ملک کے حقیقی معاشی مسائل حل ہو سکتے ہیں۔ موجودہ ٹیم اب تک ایسی کسی صلاحیت کا کوئی ثبوت نہیں دے سکی۔

پاکستانی قوم کی بدقسمتی ہے کہ اس کی سیاسی اور معاشی قیادت کو نہ مسائل کا پورا ادراک ہے اور نہ ہی وہ ذاتی اور گروہی مفاد سے بلند ہو کر خالص قوم کے مفاد اور ملت اسلامیہ کے مقاصد کی روشنی میں معاشی پالیسی کے اہداف اور صحیح ترجیحات متعین کرنے کا عزم اور صلاحیت رکھتی ہے۔ معاشی پالیسی سازی' یا تو وقتی محرکات اور داعیات کی اسیر رہی یا پھر اسے محض بیرونی امداد اور قرضے حاصل کرنے' ذاتی مفادات کے تقاضے پورے کرنے اور بیرونی اداروں کے احکامات اور ترغیبات کو ملکی پالیسی کا لبادہ اوڑھانے تک محدود کر دیا گیا۔ ہم کسی کا نام لینا مناسب نہیں سمجھتے لیکن یہ ایک حقیقت ہے کہ ہماری وزارت خزانہ سے متعلق کلیدی شخصیات اور ورلڈ بنک اور آئی ایم ایف کے درمیان کچھ ایسا رشتہ اور تعلق وجود میں آگیا جس کا اولیں نشانہ آزاد پالیسی سازی بنی اور آج تک قوم اس کا خمیازہ بھگت رہی ہے۔ ہمارے معاشی بحران کا سب سے بنیادی سبب بیرونی قرضوں پر مبنی ترقیاتی حکمت عملی ہے جس نے قوم اور حکومت کی ترجیحات کو بری طرح بگاڑ دیا اور ہم ایک ایسی معاشی ترقی کے چکر میں پڑ گئے جو پیاس بجھانے کے لیے سمندر کا پانی پینے کے مترادف ہے' جس سے پیاس کبھی بجھ نہیں سکتی۔ یہی وہ پہلی ٹیڑھی اینٹ ہے جس کے نتیجے میں وہ پوری دیوار ٹیڑھی بنی جس کی تعمیر میں ہم نے یہ پچاس سال گنوا دیے اور جس کے نتیجے میں ڈھائی ہزار ارب روپے کے قرضوں کا پہاڑ جیسا بوجھ ملک و قوم کی کمر توڑ رہا ہے اور اس بوجھ سے نجات کی کوئی صورت نظر نہیں آ رہی۔

پاکستان کے معاشی مسئلے کا کوئی حل اس وقت تک ممکن نہیں جب تک مرض کی صحیح صحیح تشخیص نہ کر لی جائے' منزل کا واضح تعین ہو' ترجیحات کی مناسب تشکیل ہو' قوم اور اس کے تمام طبقات کو پوری طرح اعتماد میں لیا جائے اور فیصلوں سے لے کر عملی کارگزاریوں تک میں شریک کیا جائے۔ جب تک ہمارا قبلہ

درست نہیں ہوتا' اور پوری معاشی حکمت عملی واشنگٹن کی طے کردہ ترجیحات نہیں بلکہ ملت اسلامیہ پاکستان کی ترجیحات کے مطابق ترتیب نہیں دی جاتی' ہم اس بحران سے نہیں نکل سکتے۔ وزیراعظم اور وزیر خزانہ نے اسلامی معیشت اور اسلامی بنک کاری کا ذکر ضرور کیا لیکن اس سمت میں برائے نام بھی کوئی قدم نہیں اٹھایا گیا اس لیے کہ ان چیزوں کا کوئی مقام اس حکمت عملی میں ہے ہی نہیں جس پر پورا کاروبار حکومت چلایا جا رہا ہے۔ صاف نظر آ رہا ہے کہ اس ڈگر پر چلتے رہنے کا نتیجہ مکمل تباہی کے سوا کچھ نہیں۔ جب تک پالیسی میں انقلابی تبدیلیاں نہ لائی جائیں اور قوم و ملت کے اصل عزائم و اہداف کی روشنی میں اس کی یکسر تشکیل نہ ہو' محض پیوند کاری سے کوئی فرق واقع نہیں ہو سکتا۔ اس سلسلے میں ہماری نگاہ میں جن بنیادی تبدیلیوں کی ضرورت ہے ان کے چند نمایاں پہلو حسب ذیل ہیں:

۱۔ مقصد محض معاشی ترقی اور پیداوار میں اضافہ نہیں' بلکہ ایک ایسا صحت مند معاشی نظام قائم کرنا ہو جو انصاف پر مبنی ہو' جس میں مخصوص مفادات کو تحفظ حاصل نہ ہو اور جس کے سامنے ملک کی پوری آبادی کے لیے عزت کی روزی کی فراہمی اور ملک کے لیے ایسی معاشی قوت کا حصول ہو جو ہماری اپنی آزادی اور تہذیبی اقدار کی محافظ ہو سکے۔ بلاشبہ اس مقصد کے حصول کے لیے معاشی جدوجہد' پیداوار میں اضافہ' فنی مہارت کا حصول اور پیدا آوری صلاحیت کی ترقی بھی ضروری ہے لیکن یہ سب کچھ غربت کے خاتمے' دولت کی منصفانہ تقسیم' تعلیم اور صحت کی سہولتوں کی فراہمی' مناسب دفاعی تیاری اور سوسائٹی کے ہر فرد کے لیے باعزت زندگی کے ذرائع اور عوامل کے حصول کے لیے ہو تاکہ معاشرے میں انصاف کا قیام اور معروف کا رواج ہو سکے اور اسے منکرات اور ظلم و عدوان سے پاک کیا جا سکے۔

۲۔ اس مقصد کے حصول کے لیے ضروری ہے کہ قرضوں پر مبنی معاشی ترقی کی حکمت عملی سے کلی نجات حاصل کی جائے۔ سودی معیشت کی جگہ نفع و نقصان پر مبنی معیشت کا نظام قائم کیا جائے۔ پارلیمنٹ باقاعدہ ایک قانون کے ذریعے سودی لین دین کو ختم کرے اور خود انحصاری کی بنیاد پر متبادل نظام کے نقشے طے کرے۔ بیرونی قرضوں کے سلسلے میں عالمی اداروں اور حکومتوں سے نئے معاہدات کیے جائیں اور ہر معروف طریقے کو اختیار کر کے ان کی ادائگی کا نیا نظام (re-scheduling اور re-structuring) طے کیا جائے نیز ایک معقول مدت کے لیے رضامندی سے مہلت (moratorium) حاصل کی جائے تاکہ ملکی معیشت کو اس مقام تک لایا جا سکے جہاں سے ہم بین الاقوامی ذمہ داریوں کو ادا کر سکیں۔ ملکی قرضوں کو بھی ایک متعین نظام کے تحت ادا (liquidate) کرنے کا پروگرام بنایا جائے۔ یہ ایک بڑا بنیادی فیصلہ ہے جس کے بغیر ہم موجودہ دلدل سے نہیں نکل سکتے۔ یہ ہمارے ایمان کا بھی تقاضا ہے اور معاشی حکمت (economic wisdom) بھی اس سمت رہنمائی کرتی ہے۔

۳۔ ملک کی معاشی اور سیاسی زندگی سے کرپشن' بدعنوانی' ظلم اور استحصال کا خاتمہ اولیں ترجیح ہونا

چاہییے۔ کیا ظلم ہے کہ ایک طرف ملک کی ایک چوتھائی سے زیادہ آبادی کو دو وقت کی روٹی اور صاف پانی میسر نہیں اور دوسری طرف چند ہزار ذی اثر افراد سرمایہ دار اور زمین دار ہیں جو ملک کی دولت پر قابض ہیں اور اسے اپنے ذاتی عیش و عشرت کے لیے استعمال کر رہے ہیں اور تمام قومی تقاضوں سے غافل دونوں ہاتھوں سے لوٹ رہے ہیں۔ حکومت کے ذمہ دار اس بات کا برابر اعتراف کر رہے ہیں کہ قومی دولت کا تقریباً پچاس فی صد ناجائز معیشت (Black Economy) کے چنگل میں ہے۔ پانچ سو ارب روپے سالانہ بدعنوانی اور کرپشن کی نذر ہو رہے ہیں۔ سو ارب سالانہ سے زیادہ کے ٹیکس ادا نہیں ہو رہے، دو سے تین ارب ڈالر سالانہ ملک سے باہر ناجائز طور پر منتقل کیے جا رہے ہیں۔ دو سو ارب سے زیادہ کے بنکوں کے قرضے اس وقت default میں ہیں۔ دیہی آبادی کے ۹۳ فی صد افراد ۳ فی صد زمینداروں اور جاگیرداروں کی گرفت میں ہیں۔ وسائل کے اعتبار سے یہ ملک غریب نہیں، غربت کی وجہ وہ ظالمانہ نظام ہے جس نے عام لوگوں کو ان کے حقوق سے محروم کر رکھا ہے اور قوم کے وسائل معدودے چند خاندانوں کی دنیا بنانے کے لیے استعمال ہو رہے ہیں۔ اس اقتدار کے ڈھانچے (power structure) اور اس کے ماتحت رونما ہونے والے اجتماعی معاشی نظام (socio - economic structure) کو تبدیل کرنا بھی وقت کی ضرورت ہے۔ اس سے قوت کے ایسے نئے سوتے پھوٹ پڑیں گے جو معاشی فراوانی اور ہمہ جہتی خوش حالی پر منتج ہوں گی۔ اگر یہ کام اخلاق اور قانون کی معروف قوتوں کے ذریعے انجام دیا جائے تو زندگی کا نقشہ بدل جائے گا اور تصادم اور خون ریزی کی نوبت نہیں آئے گی۔

۴۔ آزاد منڈی کی معیشت اور حکومت کے معاشی کردار کے سوالوں پر بھی غور ضروری ہے۔ عقل اور تجربہ گواہ ہیں کہ دونوں انتہائیں غلط اور مضر ہیں۔ نہ ایسی آزاد اور معیشت ہمارے مفید مطلب ہے جو عالمگیریت (globalisation) کے نام پر بیرونی اور ملکی سرمایہ داروں کی اجارہ داری قائم کر دے اور نہ حکومت کو ایسا معاشی اقتدار راس آ سکتا ہے جو افراد کی آزادی اور جذبہ کار کو ختم کر دے۔ دونوں کے درمیان توازن ضروری ہے تاکہ منڈی کی صلاحیتوں سے پورا پورا فائدہ اٹھایا جائے مگر ریاست انصاف کی فراہمی اور کمزوروں کے تحفظ اور انھیں مسابقت کے لائق بنانے میں موثر کردار ادا کر سکے۔

۵۔ کرپشن کے کلچر سے نجات کے ساتھ ساتھ ہمارے لیے صارفیت کے کلچر (culture of consumerism) سے بھی نجات حاصل کرنا ضروری ہے۔ فرد اور حکومت دونوں کو اپنے وسائل کے مطابق اخراجات کا راستہ اختیار کرنا ہو گا۔ چادر سے زیادہ پاؤں پھیلانا کوئی صحت مند معاشی پالیسی نہیں لیکن ہم ایسی ہی تباہ کن روش پر ایک ٹٹ دوڑتے رہے ہیں۔ اس کی بھی اصلاح کی ضرورت ہے۔ بچت اور سرمایہ کاری کے کلچر کی ترویج ضروری ہے۔ ہمارا ایک بڑا مسئلہ ہی یہ ہے کہ ملک میں بچت کی مقدار مطلوبہ سرمایہ کاری کی ضرورتوں سے کہیں کم ہے۔ اور یہی وہ چیز ہے جس کی وجہ سے قرضوں کی معیشت جنم لیتی ہے۔

ہمارے ہمسایہ ممالک میں قومی سطح پر بچت کا اوسط ۲۰ سے ۳۰ فی صد ہے جبکہ ہمارے یہاں یہ شرح ۱۲ اور ۱۳ فی صد کے درمیان ہے جبکہ سرمایہ کاری کی شرح ۱۸ فی صد اور مطلوب شرح ۲۳' ۲۴ فی صد ہے۔ نئی معاشی پالیسی میں بچت' ٹیکس' سرمایہ کاری اور اس کی صحیح ترجیحات کو مرکزی اہمیت دینا ہو گی۔

۶۔ بڑی صنعت کے ساتھ ساتھ زراعت اور چھوٹی صنعت کی ترقی کا اہتمام بہت ضروری ہے۔ اس کی لیے چھوٹے قرضے اور زرعی (ضروریات) inputs کی مناسب قیمت پر فراہمی کا نظام بنانا ہو گا۔ نیز چھوٹی صنعت کے لیے سرمایہ کاری کی سطح کو ایک ایسے مقام پر لانا ہو گا کہ وہ ملک میں بالکل نچلی سطح (grass root) پر صنعتی انقلاب لانے کا ذریعہ بن جائے۔ ہندستان میں اس وقت اس کی کل برآمدات کا ایک تہائی چھوٹی صنعت کی پیداوار پر مشتمل ہے۔ اگر پاکستان میں بھی چھوٹی صنعت کو ۵۰ لاکھ روپے تک کے سرمائے کی حد پر لا کر ضروری مراعات اور مواقع دیے جائیں تو چند سال میں معیشت کا نقشہ تبدیل ہو سکتا ہے۔

۷۔ تعلیم' صحت اور انسانی سرمائے (human capital) کی ترقی کو بھی اس حکمت عملی میں مرکزی مقام حاصل ہونا چاہیے۔ اسی طرح تقسیم دولت' مناسب اجرت اور ہر سطح پر معیشت کے لیے participatory ماڈل کی تشکیل ضروری ہو گی۔ ٹیکس کے نظام کو بالکل از سرنو مرتب کرنا ہو گا اور ہر سطح پر مناسب incentives فراہم کرنے ہوں گے۔

۸۔ سیاسی نظام میں آزادی' جمہوری اقدار کا احترام' قانون کی بالادستی' میرٹ کا اہتمام' انتظامی مشینری کی غیر جانب داری اور پیشہ ورانہ مہارت (professionalism)' عدلیہ کی آزادی' پولیس کی تطہیر اور اصلاح' غرض ان سب شعبوں میں بھی ایسی اصلاحات کی ضرورت ہے جو حقیقی قومی بیداری اور کسی مقصد کی لیے توانائیوں کو مرکوز کرنا (mobilization) کو ممکن بنا دے۔ ایک مناسب اور موثر اطلاعی پالیسی (information policy) بھی اس اصلاحی پروگرام کا ایک حصہ ہو گی۔

ملک میں جس نوعیت کی بنیادی اور انقلابی تبدیلیوں کی ضرورت ہے' ان میں مندرجہ بالا کو فیصلہ کن حیثیت حاصل ہے۔ آج ہم جس مقام پر کھڑے ہیں وہاں روایتی بجٹ اور روایتی معاشی منصوبے بے کار ہو چکے ہیں۔ وقت کی اصل ضرورت ایسی تبدیلیاں ہیں جو موجودہ جمود (status quo) پر ضرب لگائیں اور ایسی تبدیلیوں کو فروغ دیں جن سے عوامی طاقت کے نئے سوتے پھوٹیں اور ایک ایسا معاشی نظام وجود میں آسکے جس میں سب کے لیے برابر کے مواقع اور عزت کی زندگی کا حصول ممکن ہو تاکہ انسان "فقر اور کفر" دونوں کے فتنوں سے بچ سکے اور جسم اور جان کی صلاحیتوں کو ان اعلیٰ مقاصد کی خدمت کے لیے وقف کر سکے جو بحیثیت خلیفۃ اللہ فی الارض اس کے فرائض منصبی کا حصہ ہیں۔